پروفیسر ایم۔ ایم شریف

تعلیم اور کردار سازی

پاکستان کا موجودہ نظامِ تعلیم کردار سازی اور ایک ایسی قوم کی تعمیر کے لیے جس کے افراد دیانت اور احساسِ ذمہ داری کے حامل ہوں، مطلقاً ناکافی ہے۔ اگر قوم میں ایسے انسان پیدا کرنے ہوں تو اس مقصد کے لیے ایک نیا نظامِ تعلیم درکار ہوگا۔

کردار کی تعمیر کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔

(۱)

کردار سازی کا ابتدائی مرحلہ، پیدائش سے لے کر چھ سال کی عمر تک کا زمانہ ہوتا ہے۔ زندگی کے اسی دور میں کردار کی بنیادیں پڑتی ہیں اور اس کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اگر والدین خود ہی کردار کی خامیاں رکھتے ہوں تو ایسی صورت میں وہ نظم و ضبط، راست بازی، عملی اقدام اور دیانت کے بجائے، غیر ذمہ داری، دروغ گوئی اور مکر و فریب کا بیج بوتے ہیں۔ ایسے ملک میں جہاں آبادی کا ۸۵ فیصد حصّہ ناخواندہ ہو، کردار کی صحیح بنیادیں رکھنے کے لیے مندرجۂ ذیل تدابیر نہایت ضروری ہیں:

۱۔ مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم۔ لیکن اس مقصد کے لیے موجودہ انتظامات کے علاوہ مساجد اور ان سے ملحقہ عمارات کو بھی کام میں لانا پڑے گا ورنہ مفت اور لازمی تعلیم کا یہ خواب ایک صدی میں بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

۲۔ تعلیم بالغاں۔ تاکہ والدین کو معلوم ہو سکے کہ انھیں اپنے بچوں میں کن صفات کو راسخ کرنا ہے۔

۳۔ دیہی امداد اور سماجی خدمت کے اداروں کے ذریعے والدین کی تربیت۔ ان اداروں کا فرض ہوگا کہ وہ مندرجۂ ذیل نکات والدین کے ذہن نشین کرا دیں:

اول یہ کہ وہ اپنے بچّوں کو، ایامِ علالت کے سوا، ہمیشہ مقررہ اوقات پر کھلائیں پلائیں۔

دوم یہ کہ وہ اپنے ماحول کو، اپنے گھروں کو، اپنے بچوں کو اور خود اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھیں بلکہ اس بارے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ ان اوصاف میں انفرادی یا جماعتی حیثیت سے امتیاز حاصل کریں، انھیں مذکورہ اداروں کی طرف سے انعامات بھی دیے جائیں۔

سوم یہ کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ یا اُن کے سامنے جھوٹ بولنے سے ہمیشہ احتراز کریں۔ نیز یہ کہ نہ تو بچّوں کو گالیاں دیں اور نہ اُن کے سامنے کبھی آپس میں گالی گلوچ کریں۔

چہارم یہ کہ وہ بچوں سے کبھی جھوٹے وعدے نہ کریں اور ہمیشہ اپنے قول کی پاسداری کریں۔

پنجم یہ کہ چھوٹے چھوٹے گھریلو کاموں میں بچوں کو اپنے ساتھ شرکت کا موقع دیا کریں۔ اور اگر وہ خوش اسلوبی سے کام کریں تو ان کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی جائے۔

ششم یہ کہ بچوں کو غلط کاموں سے روکنے اور اچھی باتوں کی ترغیب دینے کے لیے دھمکی ڈانٹ پھٹکار اور جسمانی سزا کا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیے بلکہ ہمیشہ محبت، شفقت اور تحمّل سے کام لینا چاہیے۔

ہفتم یہ کہ ان اصولوں پر عمل کرنے کے اچھے نتائج اور اُن کی خلاف ورزی کا بُرا انجام دکھانے کے لیے دستاویزی فلموں سے کام لیا جائے۔

ہشتم یہ کہ بچوں کے لیے مٹی اور پلاسٹک کے کھلونے نیز دیگر تعلیمی کھلونے فراہم کیے جائیں اور ان کے جذبات کو دبانے اور کچلنے سے سخت احتراز کیا جائے۔

اگر دیہی امداد اور سماجی بہبود کے ادارے ان معاملات میں والدین کو کامیابی کے ساتھ تربیت دے سکیں تبھی ہمیں یقین ہو سکتا ہے کہ کردار کی بنیادیں صحیح طور پر رکھی گئی ہیں۔

(ب)

کردار سازی کا دوسرا مرحلہ سنِ بلوغ سے پہلے، چھ سے چودہ سال تک کی عمر ہوتی ہے (یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا دور ــــ پہلی سے آٹھویں جماعت تک) یہ زندگی کا وہ دور ہے جب کہ لڑکوں اور

لڑکیوں میں جنسی شعور بیدار نہیں ہوتا۔ وہ جنسِ مخالف کے بجائے عموماً اپنے ہی ہم جنسوں کی صحبت پسند کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں مخلوط تعلیم تمام برائیوں سے محفوظ ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ مخلوط تعلیم کے ذریعے بچوں کو، جنسِ مخالف کے افراد کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ریاستِ سوات میں بڑی کفایت اور بہترین نتائج کے ساتھ مخلوط تعلیم دی جا رہی ہے۔

اس مرحلے میں بچوں کے اندر احساسِ فرض اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کی ذمہ داری والدین کے علاوہ اساتذہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔

مندرجۂ ذیل تدابیر اس مرحلے کے لیے نہایت ضروری ہیں:

۱۔ اساتذہ کو چاہیے کہ خود بھی صاف ستھرے رہیں، اسکول کے اندر ہر جگہ پوری صفائی رکھیں اور طلبہ کو صاف رہنے کی تاکید کریں۔

۲۔ انھیں کبھی جھوٹا وعدہ نہ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اساتذہ کو تعلیمی ضابطے کے تحت ان اصولوں کی پیروی کے لیے ہدایت کی جائے جو والدین کے لیے قاعدہ نمبر ۳ کی مختلف شقوں میں (سوم تا ہفتم) بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ اس مرحلے میں علاقائی پیشوں سے متعلق مشاغل کو اور کھیلوں کو اسی قدر اہمیت دینی چاہیے جتنی لکھنے پڑھنے یا دیگر علوم کی تدریس کو حاصل ہے۔ سالانہ امتحانات میں طلبہ کو صفائی، گھر کے کام، پابندیٔ وقت، باہمی تعاون، صداقت شعاری اور احساسِ فرض پر نمبر ملنا چاہیے۔

۴۔ اس مرحلے میں مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔

۵۔ اسی طرح غیر درسی سرگرمیاں مثلاً کھیل، تابلو، موسیقی وغیرہ اس لحاظ سے ضروری ہیں کہ وہ طلبہ کو احتباس اور کردار پر اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتی ہیں۔

۶۔ مقابلتہً غبی طلبا کے لیے علاحدہ جماعت بندی ضروری ہے ورنہ یا تو وہ ذہین طلبہ کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ یا خود کچھ حاصل نہیں کرتے۔

(۷)

۱۔ کردار کی تشکیل و تعمیر کا تیسرا مرحلہ عنفوانِ شباب یعنی ۱۵ سے ۱۸ سال کی عمر ہے (اعلیٰ ثانوی تعلیم ـــ جماعت نہم سے دوازدہم تک)

۲۔ کردار کے نقطۂ نظر سے یہ زندگی کا سب سے زیادہ نازک اور خطرناک دور ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب ابتدائی مراحل میں ناقص تربیت پائے ہوئے طلبہ مجرم بن جاتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا جنسی شعور بیدار ہو جاتا ہے لہذا ان کی علاحدگی ضروری ہے۔ اس مرحلے میں مخلوط تعلیم یقیناً نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اسی زمانے میں ہم جنسیت کے رجحانات فروغ پاتے ہیں لہذا ہاسٹلوں میں رہنے والے طلبہ و طالبات کو ایسے بڑے کمروں میں رکھنا چاہیے جن میں ۱۵ تا ۲۵ طلبہ کی گنجائش ہو اور جہاں ہاسٹل کے نگران کی نظریں پڑتی رہیں۔ مطالعہ کے لیے ایک علاحدہ کمرہ ہونا چاہیے جہاں ہر طالب علم کے لیے ایک ڈیسک مخصوص ہو۔

۳۔ خالص نظری تعلیم کو بہت کم طالب علم پسند کرتے ہیں۔ طلبہ کی اکثریت اس سے متنفر رہتی ہے۔ لہذا درس و تدریس کے ساتھ کھیل اور جسمانی مشاغل کا تال میل ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ تمام اسکولوں کو پہلو دار بنا دینا چاہیے جس میں علمی اور ٹکنیکل دونوں طرح کے کورس پڑھائے جائیں تاکہ جو طلبا عملی رجحانات رکھتے ہوں وہ ایسا کورس منتخب کرسکیں جس میں ٹکنیکل حصہ غالب ہو۔

۴۔ اس مرحلے میں لڑکے اور لڑکیاں بہ غایت عینیت پسند اور ہیرو پرست ہوتے ہیں اس لیے ان کی درسی کتابیں اس طرح مرتب کی جائیں کہ ان میں قومی اور بین الاقوامی اکابر کی سوانح عمریاں اور ان کے کارنامے نمایاں طور پر پیش کیے جائیں۔

۵۔ کسی درسگاہ میں صحت مند روایات تو درکنار، کوئی بھلی بری روایت قائم نہیں ہو سکتی اگر اس کی مدتِ تعلیم صرف دو سال ہو۔ لہذا دو سالہ کورس والے انٹرمیڈیٹ کالجوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ اعلیٰ ثانوی اسکول کی مدتِ تعلیم چار سال ہونی چاہیے (نہم سے دوازدہم تک) نویں اور دسویں جماعتوں کو نچلی جماعتوں کے ساتھ اور اسی طرح گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کو

کالج کے ساتھ کسی صورت میں وابستہ نہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ ہائی اسکولوں کو یا تو آٹھویں جماعت تک کے ثانوی اسکولوں میں یا نویں سے بارھویں جماعت تک کے اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تدبیریں نہایت ضروری ہیں۔ چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک کے ہائی اسکول اور گیارھویں جماعت سے بی۔ اے فائنل تک کے کالج اخلاقی حیثیت سے نقصان دہ ادارے ہیں۔

۶۔ چونکہ اس مرحلے میں طلبہ لیکچروں کے نوٹس تیار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا تعلیمی ضابطے کی رو سے ان جماعتوں کے طلبہ کو لیکچر دینے کی سختی سے ممانعت ہونی چاہیے۔ تدریس کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس میں اساتذہ سے زیادہ طلبہ عملی حصہ لیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیں اور صرف اسی جگہ ان کی مدد کریں جہاں انھیں خاص دقت محسوس ہو۔ اساتذہ کا یہ کام نہیں ہے کہ طلبہ کے دماغ کو معلومات سے بھر دیں بلکہ ان کا فرض یہ ہے کہ طلبہ کو خود کام کرنا سکھائیں اور حسب ضرورت ان کی رہنمائی کریں۔ اس مقصد کے لیے طلبہ سے سوالات پوچھنا اور سمعی و بصری ذرائع سے کام لینا چاہیے۔ اس طرز تعلیم سے نہ صرف طلبہ کے علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کے اندر اپنی مدد آپ کرنے کی عادت، خود اعتمادی، اور عملی اقدام کی صلاحیت نیز باہمی مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ گھر کے لیے کام دینا لازمی قرار پانا چاہیے اور والدین کو متنبہ کر دینا چاہیے کہ اگر کوئی طالب علم مسلسل کئی دن تک گھر کا کام کر کے نہ لائے گا تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا۔ طلبہ کمرۂ جماعت میں اتنا کچھ نہیں سیکھتے جتنا وہ گھر کا کام کرنے سے سیکھتے ہیں۔ پابندیٔ وقت، قوت اختراع و اقدام، باہمی تعاون، اچھے کھیل، اعلیٰ نظم و ضبط، اور احساس فرض کے مظاہرے پر طلبہ کے لیے خاص انعامات مقرر کیے جائیں۔ سالانہ ترقی کے امتحانات میں کردار کے ان اوصاف و رجحانات کے لیے بھی نمبر دیے جائیں اور انھیں دیگر علوم میں حاصل شدہ نمبروں کے برابر اہمیت دی جائے۔

۸۔ اساتذہ کی شرح تنخواہ میں اضافہ ہونا چاہیے تاکہ وہ معاشرے کے ایک باوقار، ممتاز اور خوددار رکن بن سکیں۔ لیکن انھیں لیکچرار ہرگز نہ کہا جائے۔ ان کا فرض منصبی لیکچر دینا نہیں بلکہ پڑھانا ہے۔ ماسٹر کا لفظ آج کل کی طرح ادنیٰ حیثیت، معمولی آمدنی اور گھٹیا قابلیت کی علامت نہ ہو بلکہ اس لقب کو باعثِ فخر و امتیاز ہونا چاہیے۔

۹۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کا موجودہ طریقہ نہایت ناقص ہے۔ اسکولوں کے اساتذہ اپنے شاگردوں کو پاس کرانے یا نمبر بڑھوانے کے لیے نمبروں کی فہرستیں آپس میں بدل لیتے ہیں۔ ممتحن اساتذہ کا یہ باہمی لین دین طلبہ کے حق میں بہت سے بگاڑ اور فساد کا سرچشمہ ہے۔ وہ طلبہ جو اس ناجائز طریقے سے کامیابی یا اچھا ڈویژن حاصل کرتے ہیں ہمیشہ بے جا رعایت کے متوقع رہتے ہیں اور جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو خود بھی جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ انگلستان کی طرح ہمارے یہاں بھی اعلیٰ ثانوی تعلیم کی چاروں جماعتوں میں طلبہ کی سالانہ ترقی کا انحصار ہیڈ ماسٹروں کی رائے پر ہونا چاہیے۔ اگر اسے یہ اختیار حاصل ہو، تو معاشرے میں ہیڈ ماسٹر کا وقار بڑھ جائے گا اور اساتذہ میں بھی احساسِ ذمہ داری پیدا ہوگا۔ جب تک ذمہ داری کا بار ایک شخص کے کندھوں پر نہ پڑ جائے وہ ذمہ دار نہیں بن سکتا۔ عزت اور وقار کے لحاظ سے کسی تحصیل یا ضلع میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا وہی مقام ہونا چاہیے جو اعلیٰ ترین حکام کا ہوتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ امتحان لینا ثانوی تعلیمی بورڈ کے فرائض میں شامل نہ ہونا چاہیے۔ بورڈ کا کام یہ ہو کہ وہ اسکولوں کے لیے قواعد و ضوابط، نصاب اور درسی کتب تیار کرے اور ان کے معائنے کا بندوبست کرے۔

۱۰۔ طلبہ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں اور ان کے باہمی روابط سے آشنا کرنے کے لیے ایک آسان کورس بارھویں جماعت کے تمام سائنس و آرٹ کے طلبہ کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔

(د)

۱۔ کردار سازی کا چوتھا مرحلہ یونیورسٹی کی منزل ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم بے حد

ناقص ہے۔ کالجوں میں یونیورسٹی ڈگری کی ابتدائی جماعتیں، اعلیٰ ثانوی تعلیم کی دو آخری جماعتوں کے ساتھ شامل رہتی ہیں۔ قاعدے کی رو سے کالجوں کو صرف سہ سالہ ڈگری کورس کی تیاری کرانا چاہیے۔ اور اس لحاظ سے کالجوں میں مذاکرہ (سیمنار) اتالیقی کام (ٹیوٹوریل) باہمی اشتراکِ عمل کے فروغ کھیلوں اور اسپورٹس پر خاص توجہ ہونی چاہیے۔ یہاں صرف وہ منتخب اساتذہ تدریس کے لیے مقرر کیے جائیں جو اپنے مضامین میں اعلیٰ، اختصاصی مہارت رکھتے ہوں۔ مفصلات کے کالجوں کو اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں تبدیل کر دینا چاہیے اور بڑے شہروں میں جہاں بہت سے کالج ہوں، انھیں ملا کر ایک مکمل یونیورسٹی کی شکل دیدینی چاہیے۔

۲۔ کالجوں میں اتالیقی کام سے مراد انشاء اور مقالہ نگاری ہے۔ ہر مضمون کے لیے ہر طالب علم کو ہفتے میں ایک اتالیقی گھنٹہ ملنا چاہیے۔ طالب علم ایک موضوع پر کتابوں کا مطالعہ کر کے ہفتے میں ایک مقالہ تیار کرے اور پھر اتالیقی گھنٹے میں اس پر بحث ہونی چاہیے۔ اس طرح طلبہ نہ صرف خود اپنی محنت اور کوشش سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھیں گے بلکہ اساتذہ کے ساتھ ان کا گہرا رابطہ قائم ہوگا۔ کالج کے مرحلے میں اساتذہ و طلبہ کے باہمی روابط اکثر بہترین نتائج پیدا کرتے ہیں۔

طلبہ کے اندر پابندیٔ وقت، احساسِ فرض، کام کرنے کا شوق، محنت کی عادت، اور مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے میں اتالیقی کام سے زیادہ اور کوئی چیز موثر و کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمارے کالج اس خدمت کو سرانجام دے سکیں تو اُن کا مقصدِ وجود پورا ہو جائے گا۔ کالجوں کا موجودہ نظام تو صاحبِ دیانت افراد پیدا کرنے میں بُری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔

(۷)

۱۔ غالباً کالجوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ ڈگری کی جماعتوں کو صحیح طریقے سے تعلیم دینے کے لیے ضروری اسٹاف مہیا کر سکیں۔ لہٰذا لیکچروں کے ذریعے تدریس کا انتظام یونیورسٹیوں کو

کرنا چاہیے جو ہر شعبۂ علم کے لیے موزوں اساتذہ فراہم کر سکتی ہیں۔

۲۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے تدریس و تحقیق اور سیمینار کے کام کی ہفتہ وار مقدار متعین ہونی چاہیے اور قواعد میں اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ جو شخص اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی برتے گا وہ ترقی کا مستحق نہ سمجھا جائے گا تاکہ اساتذہ ذمہ داری اور فرض شناسی کا اعلیٰ معیار قائم رکھیں۔

۳۔ تین افراد کی ایک خاص احتسابی کمیٹی مقرر کی جائے جس میں متعلقہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی شامل ہو۔ یہ کمیٹی فرض ناشناس اور غیر ذمہ دار لوگوں کا سراغ لگائے اور ان کی ترقی روک دے یا اگر وہ اپنی اصلاح نہ کر سکیں تو انھیں ان کے عہدوں سے ہٹا دے۔ تمام ترقیات کے لیے یونیورسٹی اساتذہ کے ذہنی اکتسابات کے علاوہ ان کی دیانت کو بھی پوری اہمیت دی جانی چاہیے۔

۴۔ اتالیقی کام اور سیمینار کو (ہر طالب علم اور ہر مضمون کے لیے ایک اتالیقی گھنٹہ فی ہفتہ کے حساب سے) خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ اگر کوئی طالب علم مسلسل دو اتالیقی گھنٹے ناغہ کرے تو صدرِ شعبہ کو اس کی رپورٹ کی جائے تاکہ اس سے جواب طلبی ہو۔ اور اگر کوئی طالب علم مسلسل تین چار ناغے کرے تو صدرِ شعبہ کو چاہیے کہ اس کا نام خارج کر دے۔

طلبہ کی علمی ترقی کی رفتار تیز کرنے اور ان میں محنت کی عادت، خود اعتمادی اور فرض شناسی پیدا کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ علاوہ ازیں اتالیقی حلقوں کی تنظیم اس لحاظ سے بھی نتیجہ خیز ثابت ہوگی کہ اس کے ذریعے طلبہ و اساتذہ دونوں کے مابین قریبی روابط قائم ہوں گے۔

۵۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح لیکچروں میں حاضری اختیاری ہونی چاہیے تاکہ طلبہ کو غیر ذمہ دار سہل انگار اساتذہ کے لیکچروں کو سننے کے لیے مجبور نہ ہونا پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو ایسے اساتذہ اپنے لیکچروں کو بلند علمی سطح پر لانے کی کوشش کریں گے یا پھر یونیورسٹی کو ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک معقول عذر مل جائے گا۔ طلبہ میں اپنی غیر مقبولیت کا خوف اساتذہ کو محنت کرنے پر آمادہ کرے گا اور

وہ اپنے لیکچروں کو طلبہ کے لیے مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش کریں گے۔

۶۔ اساتذہ کے لیے کمروں کا انتظام کیا جائے جہاں وہ سیمینار اور مطالعہ و تحقیق کے کام کر سکیں۔ اگر ابتدا میں ہر استاد کو علاحدہ علاحدہ کمرے نہ دیے جا سکیں تو دو دو استادوں کے لیے ایک ایک کیوبیکل ضرور مہیا کیا جائے۔

۷۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے فرض دن میں دو سے زیادہ اتالیقی گھنٹے نہ ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے کہ بعض مضامین میں دو تین یا چار طالب علم تک ایک ہی سیمینار میں بفرورت رکھنا پڑیں لیکن اس صورت میں استاد کا یہ فرض ہوگا کہ وہ طلبہ کے مضامین کی کاپیاں اپنے ساتھ گھر لے جائے، ان کی اصلاح کرے اور پھر آئندہ سیمینار میں طلبہ سے ان پر بحث کرے۔

۸۔ یونیورسٹی کی طرف سے طلبہ کو ترغیب دی جائے کہ وہ تعطیلات میں سماجی کام کریں اور سماجی بہبود کی تنظیموں کی طرف سے ان کی کارکردگی کی اچھی رپورٹ پر انھیں سالانہ جلسے میں خاص انعامات دیے جائیں۔

۹۔ یونیورسٹی کی تعلیم یعنی اعلیٰ ثانوی مدارج کے بعد کی تعلیم بہت مہنگی پڑتی ہے اور مالدار سے مالدار ملک بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ علاحدہ یونیورسٹیوں کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس مرحلے میں مخلوط تعلیم بلحاظ سہولت و کفایت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ۱۸ یا ۱۹ سال کی عمر کے طلبہ و طالبات لڑکے اور لڑکیاں نہیں رہ جاتے بلکہ بالغ و باشعور مرد و عورت ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے لیے مردوں اور عورتوں کی یکجائی انسانیت آموزی کا باعث ہوتی ہے۔ آئندہ مردوں اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جداگانہ کالجوں کے رواج کی حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہیے۔

۱۰۔ مجوزہ تبدیلیوں کا تقاضا یہ ہے کہ تمام ڈگری تعلیم یونیورسٹیوں کے ذمے ہوگی لیکن یونیورسٹیوں کے لیے تدریسی کام میں مقامی کالجوں کے ممتاز اساتذہ کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہوگا۔ ایک کالج کا پروفیسر یونیورسٹی کا پروفیسر یا ریڈر یا لیکچرار بھی ہو سکتا ہے۔

اگر مندرجۂ بالا سفارشات پر عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ گھر، اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم طلبہ کے

اندر اخلاقی، معاشرتی اور قومی شعور کی نشوونما، اور ایک حد تک اساتذہ کی اصلاح، میں کارگر ثابت نہ ہو۔

اگر ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ سرتا پا فرسودہ نظامِ تعلیم جو عہد ماضی میں غلامانہ ذہنیت کے کلرکوں کی ایک جماعت پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا، محض چند جزئی تبدیلیوں سے اس کی قلب ماہیت ہو جائے گی تو یہ ہماری خام خیالی ہے۔ اعلیٰ تہذیب، اعلیٰ کردار اور اعلیٰ قابلیت کے افراد پیدا کرنے کے لیے بالکل نئے نقشوں کے مطابق ایک صحت مند اور صالح نظامِ تعلیم کی تشکیل درکار ہے اور اس مختصر سے مضمون میں اس مطلوبہ نظام کا بنیادی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی افکار

مصنفہ پروفیسر رشید احمد

سیاسی نظریہ سازی کی تاریخ میں مسلمان مفکروں اور مدبروں کے نظریات کی خاص اہمیت ہے لیکن ان کے نظریات کو ایک جگہ جمع کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مختلف زمانوں اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے بارہ مفکروں کے نظریات پیش کیے گئے ہیں اور کتاب کے شروع میں قرآنی نظریۂ مملکت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس کو تمام مفکرین نے اپنے نظریات کی بنیاد قرار دیا ہے

قیمت ۵۰/۷ روپے

اقبال کا نظریۂ اخلاق

مصنفہ پروفیسر سعید احمد رفیق

انسانی ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے، ان میں ایک اخلاق بھی ہے چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی مختلف تحریروں اور اشعار میں اخلاق پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ حیات میں انفرادی، اور اجتماعی اخلاق اور اخلاقی اقدار کی جو اہمیت ہے اس کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔

قیمت مجلد ۴ روپے

غیر مجلد ۳ روپے

ملنے کا پتہ: سیکرٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور